سبطِ حسن: اُردو نثر میں تعقل پسندی کا ایک منفرد حوالہ

حمادرسول*

Abstract:

Syed Sibt-e-Hassan was a Marxist Idealist and Radical Laureate. He had great contribution in Urdu Journalism, Political and Social Science, Literature, History and Culture. He put-new lite through his writings for the promotion of Scientific Rational Approach to strengthen the foundation for the critical thought process to uphold democratic values in the society.

Stereotype customs and clitches and superstition of the past were interpreted in a new way under the light of historical and Marxist perspective to harmonize the contemporary compulsions. Theological based approach and interpretation regarding religion, society and culture imposed the inertia in the society, were confronted with on the basis of logic reasoning and inference. This abstract is a subtle analysis of the ideas and thoughts of Syed Sibt-e-Hassan through which new arena of his genius is exposed.

ملک کے مشہور مارکسی دانشوراور روشن خیال ادیب سیّد سبطِ حسن ۱۹۱۶ء کوامباری ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ [۱] انہوں نے صحافت، سیاست، ادب تاریخ اور سماجی علوم کے ذیل میں نہایت گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ سیّد سبطِ حسن اس عقلی ہیجان کے وارث تھے۔ جس کا آغاز ہالینڈ اور فرانس سے ہوا اور جس نے پورے مغرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جس کے فروغ میں قندور سے والٹیئر، کبانے، دیدرو، دالمبر، دولباخ اور ماں تسکو نے کردار ادا کیا۔ [۲] مسلم تاریخ میں اس تحریک کا آغاز معتزلہ سے ہوتا ہے جس کا بانی واصل بن العطاء [۳] تھا۔ مصر میں محمد عبدہٗ، ترکی میں نامق کمال، اور شام میں امیر شکیب ارسلان اور برصغیر پاک و ہند میں سر سیّد احمد خاں کا نام اور ذات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ [۴]

* ریسرچ سکالر شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

روشن خیالی اور عقلیت پسندی کی اس فکری روایت کو آگے بڑھانے میں سیّد سبطِ حسن کا ایک خاص کردار ہے جو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ترقی پسند فکر سے وابستگی اور مارکسزم کے مطالعے نے انہیں زندگی کو ایک خاص انداز سے دیکھنے اور پرکھنے کا قرینہ عطا کیا تھا۔ مارکسزم کے ابتدائی اُصول انہوں نے مشہور مارکسی مورخ ڈاکٹر محمد اشرف سے سیکھے تھے جس کا اظہار اُنہوں نے ان الفاظ میں کیا:

> ''سوشلزم کے ابتدائی اُصول میں نے مشہور انقلابی مورخ ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم سے سیکھے تھے۔ یہ اُن دِنوں کا قصہ ہے جب ملک پر انگریزوں کی عملداری تھی اور اشترا کی لٹریچر کا داخلہ بالکل ممنوع تھا۔ کبھی کبھی کارل مارکس، اینگلز یا لینن کی کوئی کتاب چوری چھپے آجاتی تو اس کی سائیکلوسٹائل نقلیں خفیہ طور پر گشت کرتیں مگر ہم لوگوں کی رسائی ان دستاویزوں تک نہ تھی۔''(۵)

آئیڈیالوجی کسی بھی فرد یا قوم کی زندگی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے کیونکہ آئیڈیالوجی نہ صرف فرد یا قوم کو شناخت عطا کرتی ہے بلکہ منزلِ مقصود کے تعین اور اُس تک رسائی کا راستہ بھی متعین کرتی ہے۔ مشہور مارکسسٹ اصغر علی انجینئر کی رائے میں:

> ''نظریہ مقصود منزل کے حصول کا اہم ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ منزل سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اِس کی نشاندہی بھی کرتا ہے گویا نظریے اور اس کے مقصود میں ایک طرح سے جدلی رشتہ ہوتا ہے۔ نظریہ بھی اور اس سے حاصل ہونے والا مقصود بھی انسان شعوری طور پر طے کرتا ہے۔ اِسی طرح نظریہ اور اس کے تحت تخلیق ہونے والا ادب بھی انسان کے شعور کی پیداوار ہے۔''(۶)

ادب زندگی کا عکاس و ترجمان ہوتا ہے اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شعراء و ادباء نے نہایت گرانقدر ادب تخلیق کیا مگر کسی بھی فکری تحریک اور رجحان کو صرف تخلیقی ادب تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی دوسری اور بھرپور جہت فکری تحرک کی ہوتی ہے۔ کوئی بھی زندہ اور ہمہ گیر تحریک جو اپنے عصر کا گہرا شعور رکھتی ہے تہذیبی مسائل کو بھی زیر بحث لے کر آتی ہے جس میں تاریخ، فلسفہ، الٰہیات، سماجیات اور دیگر جملہ علوم و فنون شامل ہیں۔

سبطِ حسن نے بھی نہایت نامساعد حالات میں مسائل زندگی کو اپنی گفتگو اور مطالعے کا موضوع بنایا اور ان مسائل زیست کی تفہیم و تعبیر کے لئے عقلیت پسندی اور سائنسی طرزِ فکر کو اختیار کیا۔ سبط صاحب ایک کمیٹڈ مارکسسٹ تھے اور یہی وابستگی اور کمٹمنٹ تھی کہ انہوں نے تاریخ، تہذیب، عقائد، ادب، افکار اور سماج کے مطالعے مارکسی اُصولوں کی روشنی میں کیے۔

عقائد و افکار کے مطالعے کے دو رُخ ہیں اوّل یہ کہ ان عقائد اور افکار کو حتمی تصور کرتے ہوئے ان کی روشنی میں مادی کوائف کی تعبیر کی جائے اور انہیں اس کا نتیجہ قرار دیا جائے جبکہ دوسرا رُخ وہ ہے جو کہ مارکسزم کا پیش

کردہ ہے۔ جس میں فرد کا شعور اس کے سماجی وجود کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر زندگی شعور سے جنم نہیں لیتی بلکہ شعور زندگی سے جنم لیتا ہے۔ انسانی تاریخ چند فلسفیوں، حکما یا چند بااثر افراد کے تصور اور نظریات سے متعین نہیں ہوتی بلکہ انسانی تاریخ تو سماجی رشتوں سے متعین ہوتی ہے اور یہ سماجی رشتے پیداواری قوتوں سے متعین ہوتے ہیں۔

یہی وہ مارکسی اُصول ہے جس کی روشنی میں سبطِ حسن نے اپنے مطالعے کو آگے بڑھایا اور تمام تر مسائلِ زیست کو اس عہد کے سماجی حالات اور پیداواری نظام کی روشنی میں پیش کیا۔ سیّد سبط حسن نے دیگر لوگوں کی طرح اپنے کمیونسٹ ہونے پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی وہ اپنے خیالات اور نظریات میں نہایت واضح تھے اور اپنی اِس وابستگی پر انہیں فخر تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا:

''مجھے اِس بات پر فخر ہے اور مجھے کمیونسٹ ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں بلکہ اگر میں دوبارہ پیدا ہوں گا تو پھر وہی کروں گا جو میں نے کیا تھا۔''(۷)

خیالات و نظریات کا یہی حسن تھا جس کی بدولت ان کی تحریروں میں ہمیں منافقانہ روش دکھائی نہیں دیتی بلکہ ایک سائنسی طرزِ استدلال ہے جو ان کی تحریروں میں جا بجا دکھائی دیتا ہے لہجے کی یہی صاف گوئی اور شفافیت تھی جس کی بنا پر انہیں بہت سی صعوبتوں کو برداشت کیا بالخصوص عہدِ آمریت میں کہ آمرانہ قوتوں کو بیدار ذہن لوگ کبھی قبول نہیں ہوتے۔

ہمارے ہاں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ملک دشمن قرار دیا جاتا رہا ہے اور اس فکر کے فروغ میں مفاد پرست طبقہ جو کہ اسلام کے نام پر جاری نظامِ استحصال کو عوام پر مسلط کرتا ہے اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ پاکستان کے قیام میں جتنا فعال کردار کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ادا کیا شاید ہی کسی اور سیاسی جماعت نے کیا ہو یہ کمیونسٹ پارٹی کے ورکر ہی تھے جنہوں نے گلی گلی جا کر لوگوں کو حقِ خودارادیت کا شعور دیا اور پارٹی نے اپنے پرچوں اور اخبارات کے ذریعہ سے پاکستان کی تحریک کو قوت فراہم کی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے اجلاس منعقدہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں قیامِ پاکستان کے حق میں اور پاکستان مسلم لیگ کو ترقی پسند قومی جماعت قرار دلوانے میں سیّد سبطِ حسن اور سیّد سجاد ظہیر نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ جس کے بارے میں سیّد سبطِ حسن کہتے ہیں:

''ہونا تو چاہیے تھا کہ پاکستان میں اِس پارٹی کی توقیر ہوتی جس نے ایسے وقت میں پاکستان کی تحریک کا ساتھ دیا جب اس کا کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، کوئی نام لیوا نہیں تھا۔ ہم نے جس طرح سے اپنے اخباروں میں اس تحریک کی تائید میں لکھا اور جس اُصولی طور پر پیش کیا اِس کی تو کسی مسلم لیگی لیڈر کو بھی توفیق نہ تھی۔ انہیں حق خودارادیت کا معلوم ہی نہیں تھا کہ کیا چیز ہوتی ہے۔ یقین مانیے کہ مسٹر جناح ہمارے اخبار پیپلز دار میں خود نشان لگایا کرتے تھے۔ مضامین میں ہم اپنا اخبار ہر

ہفتے خود بیچتے تھے سڑکوں پر گلیوں میں۔ تو ہمارے ہندو کارکن جو ہندو محلوں میں اخبار بیچنے جاتے تھے، لہولہان ہو کر واپس آتے تھے۔ انہیں پیٹا جاتا تھا۔ ان سے پرچے چھین کر جلا دیے جاتے تھے کیونکہ وہ بے چارے ہندو علاقوں میں جا کر پاکستان کی بات کرتے تھے۔ یہ تو ہمارا سلوک تھا۔ تحریک پاکستان سے، اور آپ نے پاکستان بننے کے بعد جو کچھ ہمارے ساتھ کیا وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ کونسا تشدد ہے جو کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں پر نہیں کیا گیا۔"(۸)

پاکستان کی حمایت میں پہلا پمفلٹ کامریڈ پی سی جوشی نے "پاکستان زندہ رہ سکتا ہے" (Pakistan is viable) کے عنوان کے تحت لکھا اور یہ کمیونسٹ پارٹی ہی کے لوگ تھے جنہوں نے پاکستان کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے میں اپنا کردار ادا کیا سبطِ حسن اِس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان جلسوں میں موہن کمار منگلم، این کے کرشنن، بی ٹی رام دیوے وغیرہ تقریریں کیا کرتے تھے۔ پاکستان کی حمایت میں ہندوؤں کے علاقوں میں ہندوؤں کو سمجھایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کے حق خودواریت کے کیا معنی ہیں؟ اور مسلم لیگ کی تاریخ کیا ہے؟ یہ کام کرتے تھے کمیونسٹ پارٹی کے رہنما اور کارکن اس کا صلہ کیا ملا؟ یہ کہ جب پاکستان میں ہم نے 'انقلاب چین زندہ باد' کے عنوان سے پہلا پمفلٹ چھاپا ویسے مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، تو خیر یہ سولہ صفحات کا پمفلٹ میں نے لکھا تھا جب چین کی سرخ فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ تو جناب اِس پر پابندی لگا دی گئی۔ عجیب بات ہے نا کہ جس چین کے ساتھ آج ہمارے حکمران دوستی کے گیت گاتے نہیں تھکتے۔ ۱۹۴۸ء میں اس کی حمایت میں لکھے جانے والے پمفلٹ پر جس میں پاکستان کا ذکر تک نہیں تھا۔ پابندی لگا دی گئی تھی۔"(۹)

سیّد سبطِ حسن تاریخی ذہنیت کے حامل تھے ان کے خیال میں خواہ ادارے ہوں یا عقائد و افکار ان کا مطالعہ تاریخی پس منظر میں کرنا چاہیے تاکہ حقیقت کا ادراک کیا جا سکے اور محرکات کو سمجھا جا سکے جو ان حقیقتوں کی اصل ہیں۔ ہر عہد کے اپنے معروضی حالات ہوتے ہیں اس لیے عقائد و افکار کی بنیاد کو سمجھنے کے لئے تاریخی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ معاملات کو اِس عہد کے تناظر میں پرکھتے ہوئے لمحہ موجود میں بہتر کلیہ بنایا جا سکے۔

عصر حاضر میں دائیں بازو کی جانب سے جس طرح کے نظریات و افکار اور عقائد کا پرچار کیا جا رہا ہے وہ تاریخی شعور سے عاری ہونے کے سبب سماج میں گھٹن اور جمود کو فروغ دے رہا ہے۔ اپنے ہر عمل کو اسلامی اور غیر اسلامی میں تقسیم کرنے والے اور اپنے افکار و عقائد اور رسم و رواج کیلئے خطۂ حجاز کو استناد بنانے والے اِس بات سے بے خبر ہیں کہ ہر عہد کی اپنی معروضیت ہوتی ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ معقولات پر منقولات کو فوق دینے سے کبھی بھی صحت مند معاشرہ جنم نہیں لیتا۔ یہی وجہ تھی کہ سید سبطِ حسن نے پاکستان میں سائنسی طرزِ استدلال

کے فروغ کے لئے اپنی تحریروں کے ذریعہ تاریخی شعور کے تحت عقائد وافکار کا تجزیہ پیش کیا ہے لکھتے ہیں:

''یہی وہ غیر تاریخی طرزِ فکر ہے جس کے تحت بعض حلقے پاکستان میں عہدِ مصطفویؐ اور خلافتِ راشدہ کے انداز کی اسلامی ریاست قائم کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کی حرکی روح کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ انہوں نے اجتہاد کے بجائے تقلید اور معقولات کے بجائے منقولات ہی کو اسلام سمجھ لیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ریاست کی نوعیت حالاتِ زیست سے متعین ہوتی ہے اور حالاتِ زیست بدل جائیں تو ریاست کا نظام بھی بدل جاتا ہے۔ مدنی ریاست کے احیاء کا مطالبہ کرتے وقت ان بزرگوں کو یہ خیال نہیں آتا کہ جن معروضی حالات میں مدنی ریاست کی تشکیل ہوئی تھی وہ دوبارہ واپس نہیں آسکتے۔''(۱۰)

سبطِ حسن کا طرزِ فکر موضوعی نہیں بلکہ معروضی تھا۔ انہوں نے زندگی کے جس پہلو پر بھی قلم اُٹھایا مارکسی تنقیدی فکر کو ہی اپنا رہنما بنایا اور یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کی تحریریں سوچنے والے لوگوں کو متاثر کرتی ہیں وہیں رجعت پسند قوتیں ان کی مذمت کرتی بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی فکر کا پرچار جو لوگوں کو سوچنے پر مجبور کرے اور انہیں عصری آگہی عطا کرے مقتدر طبقہ کو کبھی بھی پسند نہیں آتی سو کبھی ان کی تحریروں پر پابندی عائد کی گئی تو کبھی اس جرم کی پاداش میں انہیں پابندِ سلاسل کیا گیا۔ اپنی صحافتی زندگی کے دوران بھی سبطِ حسن فکری محاذ پر نہایت گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ جس کا ثبوت بمبئی کرانیکل، پیام، نیا ادب اور لیل ونہار جیسی اشاعتیں ہیں جنھوں نے لوگوں کو شعور اور روحِ عصر کی تفہیم عطا کی۔

علی گڑھ سے شائع ہونے والے ہفت روزہ 'پیام' سے سبطِ حسن نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ جو اپنی چھ اشاعتوں کے بعد بند کر دیا گیا۔ اِس کے بعد 'بمبئی کرانیکل' کے ساتھ وابستہ رہے جس کے ایڈیٹر سیّد عبداللہ بریلوی تھے۔ لکھنو آنے کے بعد سیّد سبطِ حسن نے 'نیشنل ہیرالڈ' میں لکھا۔ جو پنڈت جواہر لعل نہرو کی ملکیت تھا۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو اِس کا آخری پرچہ نکال کر اسے بند کر دیا گیا۔ نیشنل ہیرالڈ سے نکلنے کے بعد سبطِ حسن نے بمبئی سے کمیونسٹ پارٹی کے تحت نکلنے والے پرچے 'فوجی جنگ' اور 'پیپلز وار' کے ساتھ وابستہ ہوگئے زمانہ اسیری (۱۹۵۱-۵۵ء) کے بعد سبطِ حسن نے روزنامہ 'امروز' اور 'پاکستان ٹائمز' میں لکھا اور پھر جب میاں افتخار الدین نے 'لیل ونہار' نکالنے کا فیصلہ کیا تو اس کی ادارت سبطِ صاحب کے سپرد کی گئی۔ جس پر اِن کی خوشی دیدنی کی اِن کی بیٹی نوشابہ زبیری کہتی ہیں:

''کئی برس بعد وہ اتنے خوش ہوئے تھے اِس لیے کہ لاہور کے ایک بہت مشہور ہفتہ وار رسالے 'لیل ونہار' کے مدیر بنا دیے گئے تھے۔ انہیں یہ کام بہت پسند تھا۔ وہ اِس میں اُس وقت تک

رہے جب حکومت نے 'پرگریسیو پیپرز' کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا، جو 'لیل و نہار' کا مالک ادارہ تھا۔ یہ ایک لاجواب رسالہ تھا۔ اب تک پاکستان ایسا رسالہ جاری نہیں کر سکا ہے۔ یہ بالکل Time میگزین جیسا تھا اور اس کی اشاعت تیزی سے بڑھ رہی تھی مگر پھر اس رسالے کو ضبط کر لیا گیا اور میرے والد کو اس وقت تک چھوٹے موٹے کام کرنے پڑے جب تک کہ ان کے دوست روشن علی بھیم جی نے انہیں اپنے ادارے ایسٹرن فیڈرل انشورنس میں ملازمت فراہم نہیں کر دی تھی۔"(۱۱)

سبطِ حسن کی زیرِ ادارت 'لیل و نہار' نے علمی و ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کی اور اس کے ذریعہ سے لوگوں میں روشن خیالی اور جمہوری اقدار اور روّیوں کو فروغ دیا گیا۔ 'لیل و نہار' کی پالیسی کے بارے میں حسن عابدی لکھتے ہیں:

"پالیسی وہی تھی جو پروگریسو پیپرز کے باقی دو اخبارات 'پاکستان ٹائمز' اور 'امروز' کی تھی یعنی روشن خیالی اور جمہوری طور طریقوں کی پشت پناہی، رواداری، جمہوری اختلاف رائے کا احترام، کیونکہ حکمراں گروہ حزبِ اختلاف کی پارٹیوں کو ملک دشمن سمجھتا آیا تھا اور کسی کو کام کرنے کی اجازت دینے کا روادار نہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک آزاد خارجہ پالیسی، برطانوی کامن ویلتھ سے نجات، سیٹو اور سینٹو جیسے امریکی اور مغربی طاقتوں کے ساتھ فوجی گٹھ جوڑ کے معاہدوں سے علیحدگی، ملک کے اندر جاگیرداری کا خاتمہ، متوازن تجارتی پالیسی، خاص طور پر سوویت روس، چین اور دیگر سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ تجارت، ٹریڈ یونینوں کے جمہوریت اور آئینی حقوق کی پشت پناہی وغیرہ۔"(۱۲)

جو شئے سبطِ حسن کی علمی قامت کو بلند اور ان کے علمی کاموں کو وقیع بناتی ہے وہ حالات ہیں ایسے حالات جن میں انہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا کہ جب بہت سے دانشوروں نے یا تو چپ سادھ لی تھی یا مقتدر طبقہ کے سامنے سپر ڈالتے ہوئے اپنے نظریات و افکار اور قلم کو اقتدار کی غلام گردشوں میں رہن رکھ دیا تھا مگر سیّد سبطِ حسن پوری دیانت داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ انہیں اپنے آدرش عزیز تھے نظریہ اور اُصولوں پر سمجھوتا انہیں کسی صورت قبول نہ تھا اور اسی جرم کی پاداش میں انہیں ۱۹۵۱ء میں پنڈی سازش مقدمے میں ملوث ہونے کے الزام کے تحت جیل یاترا کرنا پڑی۔ نوشابہ زبیری کہتی ہیں:

"یہ ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے کہ سبطِ حسن مشہور راولپنڈی سازش مقدمے میں ملوث ہونے کے الزام میں قید کر دیے گئے۔ ان کو سزا نہیں ہوئی تھی۔ ان پر کچھ گھڑے ہوئے الزامات تھے جن کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ اربابِ اقتدار نے ان کو چار برس تک لاہور جیل میں قید رکھا۔ الزام ثابت نہ ہونے پر انہیں رہا تو کر دیا گیا مگر ان کی سخت نگرانی کی جاتی رہی۔ کچھ دنوں تک وہ مختلف اشاعتی اداروں میں معمولی قسم کے کام کرتے رہے، جو کسی طرح بھی قابلِ فخر نہیں تھے۔"(۱۳)

ہمارا معاشرہ فکری انحطاط اور جمود کا شکار معاشرہ ہے۔ جس میں توہم پرستی اور استدلال سے عاری عقیدیتیں رواج پا رہی ہیں۔ عقائد ونظریات کا ردوقبول سائنسی طرزِ فکر کی بجائے عقیدتوں کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ ہمارے ذاتی اور فکری مغالطے تاریخی مغالطّوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان تاریخی مغالطّوں سے نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ کا جائزہ سائنسی فکر کے تحت از سرِ نو کریں تاکہ حقائق اپنی اصل صورت میں ہمارے سامنے آسکیں۔

سبطِ حسن کی تحریریں اس سلسلہ کی ایک واضح اور روشن کڑی ہیں۔ وہ نوید فکر ہو یا شہرِ نگاراں، موسیٰ سے مارکس تک ہو یا پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، نوید فکر ہو یا افکارِ تازہ، سخن در سخن ہو یا انقلابِ ایران، ماضی کے مزار ہو یا ادب اور روشن خیالی ہو۔ تمام عقلیت پسندی کے فروغ اور سائنسی طرزِ فکر کی پرچارک ہیں۔

سبطِ حسن کے بے شمار علمی کاموں میں سے ایک 'ماضی کے مزار' ہے۔ اس علمی وتحقیقی کام کا خاکہ سبط حسن نے قلعہ لاہور کے ایامِ اسیری میں ترتیب دیا تھا اور اِس کا مقصد لوگوں کو مشرق کی قدیم تہذیبوں سے روشناس کروانا تھا۔ وہ قومیں زوال کا شکار ہو جاتی ہیں جو اپنی اصل اور ماضی کو بھلا دیتی ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل کی اساس ہوتا ہے۔ آباؤاجداد کے اقدارِ حیات، طرزِ معاشرت اور افکار ونظریات کو جانے بغیر مستقبل کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔

یہ کتاب جو کہ بابلی تہذیب وتمدن کے آغاز وارتقا اور زوال پر موقوف ہے۔ یہ درحقیقت وہ ماضی کے مزار ہیں جو کہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں نابود ہو گئے۔ وہ قومیں جواب موجود نہیں، وہ تہذیبیں جن کا جاننے والا اب کوئی نہیں۔ وہ زبانیں، عقائد، رسم ورواج، محاورات، فنون اور عظیم عبادت گاہیں جو زیرِ زمین چلی گئیں اور جن پر ماضی کی منوں گرد جم گئی ہے۔ زیرِ زمیں آج بھی اپنا نشاں دیتی ہیں۔ پانچ ہزار برس پرانی وادئ دجلہ وفرات کی تہذیب کہ جو بجا طور پر بنی نوعِ انسان کی پہلی منظم اور باقاعدہ تہذیب کہا جا سکتا ہے۔

۱۹/ابواب پر مشتمل اِس کتاب میں سبط حسن نے بابل تہذیب کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ بالخصوص اِسکے وہ حصے جو کہ تخلیقِ کائنات، تقدیر اور حیات وممات جیسے عقائد سے علاقہ رکھتے ہیں۔ یہ عقائد آج بھی کسی نہ کسی صورت میں رائج ہیں اور ہزار ہا لوگوں کے ایمان کا جزو لاینفک ہیں۔

بابلی تہذیب کے اِس مطالعہ سے جو کہ سائنسی طرزِ فکر اور استدلال کے تحت پیش کیا گیا ہے ہم پر واضح کرتا ہے کہ ہماری تہذیب وثقافت اور الٰہیات کے بے شمار واقعات اور عقائد ایسے ہیں جو ابتدائی صورت میں دیگر تہذیبوں کا حصے رہے ہیں اور آج بھی ہمارے ایمان کا حصہ ہیں اور جنہیں آسمانی اور حتمی تصور کرتے ہیں کی اصل سوائے ایک فکری اور تاریخی مغالطہ کے کچھ بھی نہیں۔ بابلیوں، مصریوں، کنانیوں، چینیوں، آریوں، عیسائیوں، یہودیوں

اور مسلمانوں کے عقیدہ تخلیق میں موجود مماثلتیں ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ طوفانِ نوح جو ہمارے اعتقاد کے باب میں ایک خاص اہمیت و جہت رکھتا ہے، تاریخ کے ورق اُلٹنے سے ایک خیالِ خام ثابت ہوتا ہے۔ بڑے بڑے بت منہدم ہوتے ہیں اور افکار و نظریات ریت کے محل۔

سبطِ حسن نے اُتنا پشتیم کی داستانِ سیلاب اور طوفانِ نوح میں پائی جانے والی مماثلتوں کا نہایت فکر انگیز تجزیہ پیش کیا ہے اور اسی طرح حضرت خضرؑ اور اتنا پشتیم کے مابین پائی جانے والی مشابہت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اُتنا پشتیم اور حضرتِ خضرؑ کی شخصیتوں میں بڑی مشابہت ہے۔ اُتنا پشتیم اور خضرؑ دونوں انسان ہیں لیکن دونوں کو حیاتِ ابدی نصیب ہے۔ اُتنا پشتیم اور خضرؑ دونوں دانائے راز بزرگ ہیں اور دونوں دریاؤں کے سنگم پر رہتے ہیں۔ اُتنا پشتیم گل گامش کو ناکام و نامراد لوٹا دیتا ہے۔ حضرتِ خضرؑ، حضرتِ موسیٰؑ اور سکندر دونوں کو ناکام و نامراد لوٹا دیتے ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اُتنا پشتیم کا دوسرا نام خھیسا ترا ہے تو ہمارا قیاس اور قوی ہو جاتا ہے کہ دراصل اُتنا پشتیم اور حضرؑ دونوں ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔''(۱۴)

'ماضی کے مزار' سبط صاحب کا ایک ایسا وقیع علمی کارنامہ ہے جو جمود زدہ سماج میں ایک تحرک کا باعث ہے۔ نہ صرف ماضی کے مزار بلکہ سبطِ حسن کی تمام تحریریں فکری اور عقلی تحرک کا باعث ہیں۔

سبطِ حسن نے اپنی تمام زندگی مارکسی آدرشوں کی روشنی میں بسر کرتے ہوئے تعقل پسندی اور سائنسی طرزِ فکر کے فروغ کے لئے بے انتہا کام کیا۔ ایشیا کے غریب عوام کے مسائل کا حل تلاش کرنا ان کا دیرینہ خواب تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک ملک میں جمہوری رویوں کو فروغ نہیں ملتا اور کہنہ روایات کو جو کہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے سے معذور ہیں ترک نہیں کر دیا جاتا تبدیلی ممکن نہیں اور تبدیلی یا انقلاب کے لیے ذہن سازی کا عمل از حد ضروری ہوتا ہے۔ جس کے لیے سبطِ حسن نے اپنی تمام زندگی وقف کر دی تھی جس کا ثبوت ان کی علمی اور عملی زندگی ہے۔

ہم اگر ماضی کے اوراق پلٹیں تو بے شمار ایسے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ جنہوں نے سماج اور معاشرہ میں تبدیلی کے لئے نہایت گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ ان میں علامہ نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محمد اشرف، سیّد سجاد ظہیر، دادا فیروز دین اور سبطِ حسن شامل ہیں۔ یہ تمام کے تمام وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی فکر کے ذریعہ سے بڑا تہلکہ مچایا۔ بڑی پذیرائی حاصل کی اور ایک زمانے کو اپنا اسیر کیا لیکن اس تمام کے باوجود یہ کوئی بڑا انقلاب کوئی بڑی تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

بادی النظر میں تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے لیکن اگر معروضی حالات کا غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے

کہ اس کی ایک وجہ علم وشعور سے بے بہرہ سماج ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں معقولات اور ہر منقولات کو فوق حاصل ہو اور عوام کا طبقۂ کثیر مذہبی اجارہ داری کے ہاتھوں یرغمال ہو وہاں ایک دم کسی بڑی تبدیلی کی توقع کرنا عبث ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مارکسزم یا اشتراکیت ایک فکری رویے کا نام ہے یہ کسی بھی سیاسی جماعت کے طور پر یعنی دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح انتخاب کا حصہ نہیں رہی یہ اپنی ابتداء ہی سے ایک علمی وفکری تحریک پر رہی ہے اور اپنی اس حیثیت میں اس کا کردار نہایت قابلِ تحسین رہا ہے۔ آخر میں وولفرام کرنوسکی طویل عرصہ سبطِ حسن کے ساتھ رہے ہیں کے اقتباس پر اپنی بات کا اختتام کرتے ہیں جو یقیناً اپنے اندر بہت سے سوالات رکھتا ہے:

> ’’سیاست داں اور تاریخ داں جو کچھ بھی کہیں، اگر ایک لادین عالمی انقلاب ایسے ہزاروں ملاؤں سے جنگ میں مصروف ہو جو کروڑوں غیر تعلیم یافتہ افراد کے ذہنوں اور اچھے برے خیالات پر اثر انداز ہوں گے تو کیا نتائج نکل سکتے ہیں، یہ ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے تبدیل کرلیں، خدا کی جگہ لینن، اسٹالن یا کسی اور کمیونسٹ لیڈر کو رکھیں؟ انجیل یا قرآن کے مقابلے میں کارل مارکس اور ولادی میر الیانوف لینن کو تصور کرلیں؟ نتیجہ کچھ زیادہ مختلف نہیں نکلے گا!‘‘(۱۵)

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

۱۔ یہ تاریخ پیدائش حتمی نہیں ہے جس کا اظہار سبطِ حسن نے خود الطاف احمد قریشی کو انٹرویو دیتے ہوئے کیا تھا۔(ادبی مکالمے، لاہور: مکتبہ عالیہ،۱۸۸۶ءص ۸۰)

۲۔ علی عباس جلالپوری، سیّد، خردنامہ جلالپوری (بارِدوم) لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۰

۳۔ ابوزہرہ مصری، اسلامی مذاہب (مترجم: غلام احمد حریری) لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ص ۲۱۲

۴۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، سر سیّد احمد خان اور جدت پسندی، کراچی: ارتقاء مطبوعات، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳

۵۔ سبطِ حسن، موسیٰ سے مارکس تک، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۶ء، ص ۷

۶۔ اصغر علی انجینئر، ترقی پسند ادب، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص ۸۳

۷۔ الطاف احمد قریشی، ادبی مکالمے، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۸۸۶ء، ص ۸۹

۸۔ الطاف احمد قریشی، ادبی مکالمے، ص ۹۰

۹۔ سیّد سبطِ حسن، ادب اور روشن خیالی، مرتبہ: سید جعفر احمد، کراچی، مکتبہ اقبال، ص ۱۷۹

۱۰۔ سیّد سبطِ حسن، نوید فکر، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۶ء، ص ۳۵

۱۱۔ ولفرام کرنوسکی، ای ایف یو-ایک تحریک (مترجم: باقر رضوی) کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷ء، ص ۳۲۲

۱۲۔ سیّد جعفر احمد، جنوں میں جتنی بھی گزری - ایک صحافت اور شاعر کے تجربات و مشاہدات (حسن عابدی) کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۵ء، ص ۸۳

۱۳۔ ولفرام کرنوسکی، ای ایف یو-ایک تحریک (مترجم: باقر رضوی) ص ۳۲۱-۳۲۲

۱۴۔ سیّد سبطِ حسن، ماضی کے مزار، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۹ء، ص ۴۰۰-۴۰۱

۱۵۔ ولفرام کرنوسکی، ای ایف یو-ایک تحریک (مترجم: باقر رضوی) ص ۳۲۱